اقبال : مثالی دار العلوم کا تصور

بختیار حسین صدیقی

عینی نقطۂ نگاہ سے شاگرد اور تعلیمی عمل دونوں کا تصور صرف اس صورت میں واضح ہوتا ہے جب ہم پر یہ بات اچھی طرح منکشف ہو کہ ان کی اساس ایک روحِ مطلق یا خدا ہے جس کی ذات ہر لحاظ سے اپنے کمال پر پہنچی ہوئی ہے اور یہ دنیا جس کی صفات کا ایک پرتو ہے۔ اقبال دینی عنیت کے علم بردار ہیں ، اس لیے یہ حقیقت ان پر پوری طرح آشکار ہے۔ زندگی کا اصل محرک اس کی اپنی ذات کے اثبات کا جذبہ ہے جسے وہ خودی کہتے ہیں۔ خودی کی آزادی کو اُنھوں نے بندگی یا عبدیت سے محدود کیا ہے ، کیونکہ اس کے بغیر نہ اس کی تعمیری صلاحیتیں بروئے کار آ سکتی ہیں اور نہ ہی اس کی حقیقی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ عبدیت ہی سے خودی کا تحفظ ممکن ہے ، لیکن اس کے ذریعے وہ خدا کے قریب آ کر خود منفرد ہونا چاہتی ہے ، اپنی ذات کو خدا کی ذات میں کھونا نہیں چاہتی۔ خدا میں جذب ہونے کے بجائے وہ خود خدا کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے۔[1] شاگرد چونکہ عبدیت کا حلقہ بگوش ہے ، اس لیے تعلیم کا منتہائے مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خودی کی صحیح خطوط پر نشو و نما کر کے اسے اس قابل بنائے کہ وہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے۔

مروجہ مغربی تعلیم پر تنقید ۔ قرآن کی رو سے انفس اور آفاق دونوں

۱۔ دیباچہ ''اسرارِ خودی'' ۔ انگریزی ترجمہ از آر ۔ اے ۔ نکلسن بعنوان "سیکرٹس آف دی سیلف" (لاہور : شیخ محمد اشرف، ۱۹۴۴)، ص ۱۹ ۔

میں آیاتِ الٰہیہ کا ظہور ہو رہا ہے ۔[۲] اس لیے اقبال خودی کی نشو و نما کے لیے انفس اور آفاق ، روح اور مادے یعنی مذہب اور سائنس دونوں کے مطالعے کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ سائنس انسان کو ایک بے پناہ طبعی قوت عطا کرتی ہے جسے مذہب سے حاصل ہونے والی اخلاق قوت کا مطیع بنا کر خودی فطرت کو مسخر کرتی اور خدا کو اپنے اندر جذب کرتی ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال نے جب اپنے زمانے کے علومِ جدیدہ کے اداروں بالخصوص علی گڑھ کالج اور اسلامی مدارس بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما لکھنو کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ان اداروں میں طلبا کو جس نہج پر تعلیم دی جا رہی تھی وہ ملت کی روحانی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی تھی ۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کو دیکھ کر اُنھوں نے یہ رائے قائم کی :

''موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے ، حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان ، بلکہ اس سے بھی کچھ کم ، ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو ۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی جولان گاہ بنا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ اور اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکزِ ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے ۔''[۳]

سائنس کی بنیاد محسوس اور مشہود پر ہے ۔ اس کی نظر قوانینِ فطرت پر رہتی ہے ۔ آیاتِ الٰہیہ اسے نظر نہیں آتیں ۔ سائنس کے ساتھ ساتھ زمانے

۲۔ قرآن ، ۴۱ : ۵۳ : ''ہم جلد ہی لوگوں کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے'' ؛ قرآن ، ۵۱ : ۲۱ : ''اور اہلِ یقین کے لیے زمین میں نشانیاں ہیں اور ان کے انفس میں بھی'' ۔

۳۔ ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' (خطبۂ علی گڑھ ، ۱۹۱۰) : سید عبدالواحد معینی ، مولف ، ''مقالاتِ اقبال'' ، (لاہور : شیخ محمد اشرف ، ۱۹۶۳) ، ص ۱۳۲ ۔

کے تقاضوں کے مطابق اگر ان اداروں میں دین کی بھی جامع تعلیم دی جاتی تو فرزندانِ توحید کو قوانینِ فطرت میں آیاتِ الٰہیہ بھی نظر آتیں۔ دین کو پسِ پشت ڈالنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک خالص قسم کی مادیت نظامِ تعلیم پر غالب آ گئی اور اقبال کو کہنا پڑا :

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش[۴]

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ[۵]

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے دین و مروّت کے خلاف[۶]

سیرت کی تعمیر دینی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس کے بغیر نہ نگاہِ بلند کا تصوّر کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی یقینِ محکم کا۔ لادینی تعلیم ذہن کو تو روشن کرتی ہے لیکن دل میں حرارت نہیں پیدا کرتی۔ وہ فکر کو آزاد تو کرتی ہے لیکن اسے مربوط اور منظم نہیں کرتی۔ اور فکر میں وحدت کے بغیر نہ کردار میں وحدت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی سیرت میں پختگی آتی ہے جو بالغ نظری کی اوّلین شرط ہے :

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!

• • •

مردہ لا دینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام[۷]

۴۔ ''بانگِ درا'' (کلیاتِ اُردو)، ص ۲۴۶۔
۵۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔
۶۔ ''ضربِ کلیم'' (کلیاتِ اُردو)، ص ۵۴۸۔
۷۔ ایضاً، ص ۵۴۳۔

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ[۸]

لارڈ لٹن نے ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت اسے ''ہندوستان میں معاشرتی تبدیلی کے دور کا آغاز''[۹] قرار دیا تھا ۔ سر ہملٹن گب کے نزدیک یہ ''دنیائے اسلام میں جدید طرز کا پہلا دار العلم''[۱۰] ہے ، لیکن اس جدید دار العلم اور اس جیسے دوسرے دارالعلوم نے جس قسم کی ذہنی اور معاشرتی تبدیلی پیدا کی وہ جدید و قدیم کا امتزاج ہونے کے بجائے فرنگی تہذیب کی نقالی ثابت ہوئی جس کا اسلامی مرکزِ ثقل سے دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا :

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[۱۱]

جدید تعلیم شکم پُری کے مقصد کو پورا کرتی ہے ، روح کی غذا کا سامان مہیا نہیں کرتی ۔ یہ اخلاقی اقدار کو پامال اور خودی کو مجروح کرتی ہے :

۸- ایضاً ، ص ۵۳۷ - ۵۳۸ -
۹- ''این اکاؤنٹ آف دی سریمونی آف لے انگ دی فاؤنڈیشن اسٹون آف دی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' (الہ آباد ، ۱۸۷۷) ، ص ۶۳ -
۱۰- ''ماڈرنزم'' (نیویارک ، ۱۹۵۳) ، ص ۱۸۱ -
۱۱- ''ضربِ کلیم'' (کلیاتِ اُردو) ، ص ۶۳۰ -

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا کہ جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش ![12]

وہ علم نہیں ، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو ![13]

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی ![14]

شکایت ہے مجھے یا رب ! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا ![15]

مروّجہ دینی تعلیم پر تنقید - جس طرح اقبال کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لا دینی تعلیم سے شاکی تھے اور ''آوازۂ تجدید'' کو ''تقلیدِ فرنگی کا بہانہ'' سمجھتے تھے ، اسی طرح وہ اسلامی مدارس بالخصوص دیوبند اور ندوہ میں دی جانے والی دینی تعلیم سے غیر مطمئن تھے اور اسے وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی سمجھتے تھے - ''جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے ، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے ، جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرحِ نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں -''[16] وہ ''ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل''[17] کے خواہاں تھے - ان کے نزدیک ''اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے''[18] کیونکہ قرآن

۱۲- ایضاً ، ص ۵۳۵ -
۱۳- ایضاً ، ص ۲۶۹ -
۱۴- ''بالِ جبریل'' (کلیاتِ اُردو) ، ص ۳۴۸ -
۱۵- ایضاً ، ص ۳۲۴ -
۱۶- محمد حسین خاں زبیری ، مولف ، ''مشاہیر کے تعلیمی نظریے'' ، باب ۲۱ : علومِ اسلامیہ ، (کراچی : جاوید پریس ، س - ن) ، ص ۲۷۱ -
۱۷- ایضاً -
۱۸- سید نذیر نیازی ، مترجم ، (اقبال)''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' ، (لاہور : بزمِ اقبال ، ۱۹۵۸) ، ص ۱۹۳ -

نے ''حقیقت کے اس پہلو کو جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بڑی اہمیت دی''[19] ہے۔ رسول اکرمؐ ہمیشہ یہ دعا فرماتے : ''اے اللہ! مجھے اشیا کی حقیقت سے آگاہ کر'' ۔ اشیا کی حقیقت مشاہدے اور تجربے سے معلوم ہوتی ہے جسے سائنس کی اصطلاح میں استقرائی طریقِ فکر کہتے ہیں ۔ اقبال وحی اور وجدان کے ساتھ ساتھ اس طریقِ فکر کو بھی اسلامی مدارس میں رائج کرنا چاہتے ہیں ، کیونکہ صرف اسی صورت میں ایسے بالغ نظر علما پیدا ہو سکتے ہیں جو اجتہاد کا حق استعمال کر کے ''ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل'' پر قادر ہوں ۔ ''کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علما اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں ، اس لیے کہ ان کا مبلغِ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے ۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو تاریخ ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائقِ عظمیہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے''[20] :

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ ![21]

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے[22]

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار ، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

۱۹۔ ایضاً ، ص ۲۰ ۔
۲۰۔ سید عبدالواحد معینی ، مولف ، کتاب مذکور ، ص ۱۳۵ ۔
۲۱۔ ''ضربِ کلیم'' (کلیات) ، ص ۵۴۱ ۔
۲۲۔ ''بالِ جبریل'' (کلیات) ، ص ۳۵۶ ۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق !
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق[۲۳]
آہ ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلاّ ، نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام ![۲۴]

دینی اور دنیوی تعلیم میں تربیط ۔ ''دیدۂ بینائے قوم'' کی حیثیت سے اقبال نے جب مروجہ تعلیم پر نظر ڈالی تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک طرف تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی خالص دنیوی تعلیم کی وجہ سے دینی عقائد کا شیشہ پاش پاش ہو رہا ہے ، ''تجدید'' کے نام پر فرنگی تہذیب کی کورانہ تقلید کی جا رہی ہے ، آزادیٔ فکر کے نام پر انسان کو حیوان بنایا جا رہا ہے اور ''فکرِ معاش'' دے کر اس کی روح قبض کی جا رہی ہے ، تو دوسری طرف مکتبوں اور مدرسوں میں ''رعنائیِ افکار'' اور ''لذتِ کردار'' کا کال ہے ، ''کشادہ دل'' اور ''جرأتِ اندیشہ'' کی کمی ہے ، تحقیق اور جستجو کا فقدان ہے ، تقلید کا دور دورہ ہے ، اجتہاد کے دروازے بند ہیں یا پھر قرآن کو ''بازیچۂ تاویل'' بنایا جا رہا ہے ۔ ان دو قسم کے اداروں میں سے کوئی ایک ادارہ بھی وسیع تر ملی مقاصد کو پورا نہیں کر رہا تھا ، اس لیے انھوں نے ان سے کوئی اُمید وابستہ نہیں رکھی :

نہ فلسفی سے نہ مُلاّ سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت ! وہ اندیشہ و نظر کا فساد[۲۵]

اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے ۔ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور جس طرح انفس میں ہو رہا ہے اسی طرح آفاق میں بھی ۔ اس لیے ان سے متعلق علوم کی علیحدہ علیحدہ تعلیم دینے کا کوئی جواز نہیں ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دونوں علوم کی مربوط اور منظم تعلیم کا انتظام ایک

۲۳- ''ضربِ کلیم'' (کلیات) ، ص ۴۸۳ -
۲۴- ایضاً ، ص ۴۸۷ -
۲۵- ''بالِ جبریل'' (کلیات) ، ص ۳۶۲ -

ہی ادارے میں کیا جائے:

وہ علم ، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم![۲۶]

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ۱۹۱۰ میں اپنے خطبۂ علی گڑھ میں ایک نئے ''مثالی دارالعلوم'' کے قیام پر زور دیا:

''یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم اور جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز میں ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویرِ مثالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ تخیل ، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔۔۔۔''[۲۷]

''مسلمانوں کو بیشک علومِ جدیدہ کی تیز پا رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہیے ، لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں۔۔۔۔''[۲۸]

''الندوہ ، علی گڑھ کالج ، مدرسۂ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دار العلم ہونا چاہیے جہاں افرادِ قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ تیار کیا جا سکے جس میں زمانۂ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیے۔''[۲۹]

مثالی دارالعلوم کے اغراض و مقاصد۔ مجوزہ مثالی دارالعلوم کا اصل کام ، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ، تہذیب کا وہ سانچہ تیار کرنا ہے جس میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو ہمیں ڈھالنا چاہیے۔ اس سانچے میں

۲۶- ''ضربِ کلیم'' (کلیات) ، ص ۴۸۸ -
۲۷- سید عبدالواحد معینی ، مؤلف ، کتاب مذکور ، ص ۱۳۵ - ۱۳۶ -
۲۸- ایضاً ، ص ۱۳۴ -   ۲۹- ایضاً ، ص ۱۳۵ -

''تجلیاتِ کلیم'' اور ''مشاہداتِ حکیم'' کی حسین آمیزش ہوگی ۔ اسلام اس کی روحِ رواں ہوگا اور علومِ جدیدہ اس کا قالب ۔ علومِ جدیدہ کے متعلق اقبال کی رائے یہ ہے کہ اسلامی مفکرین اور سائنس دانوں کے افکار اور تجربات ہی نے ان کے لیے راہ ہموار کی ۔ اس لیے مسلمانوں کو ان علوم کی تیز پا رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہیے :

''یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال ، بد قسمتی سے کہا جاتا ہے ، ایسے وقت میں رونما ہوا جب مسلم حکما کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لا یعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حد تک مائل ہو چکے تھے ۔ دنیائے اسلام میں تحریکِ ذہنی عملاً اس وقت سے مسدود ہوگئی اور یورپ نے مسلم حکما کے غور و فکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا ۔ یورپ میں جذبۂ انسانیت (humanism) کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں ۔ یہ کہنا مطلقِ مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین 'جذبۂ انسانیت' کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفے کی شکل میں برآمد ہوا ہے ، اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے ۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمانوں کو کیونکہ مسلمان حکما کے جو کارنامے محفوظ ہیں وہ ابھی تک یورپ ، ایشیا اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں ۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں ۔''۳۰

اقبال کے نزدیک ، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ، ''اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے'' کیونکہ قرآن نے ''حقیقت کے اس پہلو کو جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بڑی اہمیت دی'' ہے ۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نے محسوس اور ٹھوس حقائق کو اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی کہ مجرد اور غیر محسوس حقائق کو جو اس کی توازن اور اعتدال کی عمومی تعلیم کے عین مطابق ہے ۔ پس مثالی دارالعلوم میں نہ صرف دینی اور

۳۰۔ محمد حسین خاں زبیری ، مولف ، کتاب مذکور ، ص ۲۶۸ - ۲۶۹ ۔

وجدانی علوم پڑھائے جائیں گے بلکہ اس میں طبیعی اور عمرانی علوم پڑھانے کا بھی انتظام ہوگا ۔ نصاب کی تدوین میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ان کا آپس کا توازن بگڑنے نہ پائے ۔

نصابی مواد میں توازن قائم رکھنے سے زیادہ اہم وجدانی اور عقلی علوم کی تربیط یعنی ''تجلیاتِ کلیم'' کو ''مشاہداتِ حکیم'' سے ہمکنار کرنے کا مسئلہ ہے ۔ اس تربیط کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ طبیعی اور عمرانی علوم اس طرح پڑھائے جائیں کہ دینی عقائد کی چھاپ ان پر صاف طور پر نظر آئے ۔ مثلاً حیاتیات میں یہ پڑھانے کے بعد کہ زندگی زندگی سے پیدا ہوئی یا بے جان مادے سے اس کا ارتقا ہوا یہ بتانا ضروری ہوگا کہ پہلی مرتبہ زندگی کو خدا نے پیدا کیا ۔ اس کے بعد زندگی سے زندگی کے پیدا ہونے کا سلسلہ شروع ہوا ۔ اس عقیدے کے ساتھ جب نظامِ عصبی کا مطالعہ کیا جائے گا تو خدا کی قدرتِ کاملہ میں ایمان اور پختہ ہوگا اور قوانینِ فطرت آیاتِ الٰہیہ بن کر اُبھریں گے ۔ صحیح علم یقیناً حواس سے حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن یہ علم کی ابتدا ہے ۔ اس کی انتہا وہ علم ہے جو وحی اور وجدان سے حاصل ہوتا ہے اور حسی اور عقلی شعور میں نہیں سماتا ۔ یہی علم علمِ حق کی آخری منزل ہے :

علمِ حق اول حواس ، آخر حضور
آخرِ او می نہ گنجد در شعور !۳۱

''زندگی کے متعلق ملت کے زاویہ نگاہ کے دوش بدوش ملت کی روحانی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں ۔ فرد کی حیثیت ، اس کی دماغی نجات و آزادی اور طبیعی علوم کی لامتناہی ترقی ـــ ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے جدید زندگی کی اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے ۔ چنانچہ جس قسم کا علمِ کلام اور علمِ دین ازمنہ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکینِ قلب کے لیے کافی ہوتا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے ۔ اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے ۔ اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکرِ دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا لازمی ہے ۔ ۔ ۔

۳۱۔ ''جاوید نامہ'' (کلیاتِ فارسی) ، ص ۶۹۱ ۔

جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے ، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے ، اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے ، جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرحِ نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو برسرِ کار لایا جائے ۔''۳۲

مندرجہ بالا اقتباس مثالی دارالعلوم کے بنیادی مقصد پر روشنی ڈالتا ہے جسے اقبال متوازن اور مربوط نصاب کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کی دلی آرزو ''اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل'' کرکے ''فکرِ دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا'' ہے ۔ ''مشاہداتِ حکیم'' کو ''تجلیاتِ کلیم'' سے ہمکنار کرنا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے ۔ دوسری ضروری شرط یہ ہے کہ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے استخراجی طریق کے بجائے استقرائی طریقِ تعبیر و تاویل اختیار کیا جائے جیسا کہ فقہائے متقدمین نے اس سے پہلے ایک بڑھتے ہوئے تمدن کی ضروریات کے پیشِ نظر کیا تھا ۔ ''قرنِ اول کے تقریباً وسط سے لے کر قرنِ چہارم کے آغاز تک عالمِ اسلام میں اسی بنیاد پر فقہ اور قانون کے کم از کم اُنیس مذاہب کا ظہور ہو چکا تھا ۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ فقہائے متقدمین نے ایک بڑھتے ہوئے تمدن کی ضروریات کے پیشِ نظر کس سعی اور جد و جہد سے کام لیا ۔ ۔ ۔ ۔ فتوحات میں توسیع اور اضافے کے ساتھ ساتھ جب عالمِ اسلام کے مطمحِ نظر میں بھی وسعت پیدا ہوئی تو اس سے فقہائے متقدمین کو بھی ہر معاملے میں وسعتِ نظر سے کام لینا پڑا ۔ وہ مجبور ہو گئے کہ جو قومیں اسلام قبول کر رہی ہیں ان کے عادات و خصائل اور مقامی حالات کا مطالعہ کریں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس وقت کی سیاسی و ملی تاریخ کی روشنی میں ہم ان مذاہبِ فقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ تعبیر و تاویل میں استخراج کی بجائے رفتہ رفتہ استقرائی منہاج اختیار کرتے چلے

۳۲۔ محمد حسین خان زبیری ، مولف ، کتاب مذکور ، ص ۲۷۰ - ۲۷۱ ۔

گئے ۔"۳۳ پس دینی اور استقرائی (طبیعی اور عمرانی) علوم میں تربیط اور دین کی استقرائی تعبیر و تاویل کے ذریعے ایک "نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل" کرکے مثالی دارالعلوم میں تہذیب کا وہ سانچہ تیار ہوگا جس میں اقبال کے نزدیک موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو ڈھالنا چاہیے ۔ اس تہذیب میں صرف ایک نمایاں رنگ ہوگا ، یعنی دینی عقائد کا رنگ ، اس لیے اس کے علم برداروں میں وحدتِ افکار ہوگی اور وحدتِ کردار بھی اور ساتھ ہی ساتھ "ندرتِ فکر و عمل" بھی جسے اقبال "ملت کا شباب" کہتے ہیں کیونکہ اس سے خودی مستحکم ہوتی ہے اور خدا سے ہمارا شخصی تقرب بڑھتا ہے ۔

نصب العین نواز نصاب ۔ اقبال دینی عنیت کے علم بردار ہیں ۔ اُنہوں نے خودی کی آزادی کو خدا کی بندگی سے محدود کیا ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ اس کی تعمیری صلاحیتیں بروئے کار آ سکتی ہیں اور نہ ہی اس کی حقیقی نشو و نما ہو سکتی ہے ۔ اس لیے مثالی دارالعلوم کا نصاب خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کے اعلیٰ اور ارفع نصب العین پر مرکوز ہوگا ۔ "فکرِ دینی کی از سرِ نو تعمیر" کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں دینی علوم پر پورا پورا عبور حاصل ہو ، قرآنی احکام کی اصل منشا ہم پر پوری طرح عیاں ہو ، طبیعی علوم کی ترقی اور اس کے معاشرتی اثرات پر ہر دم ہماری نظر ہو ، عمرانی ، اقتصادی اور تاریخی عوامل پر ہماری گہری نظر ہو ، یعنی ہماری ذات میں "تجلیاتِ کلیم" "مشاہداتِ حکیم" سے ہمکنار ہوں ۔ اور خدا کو اپنے اندر جذب کیے بغیر یہ سعادت کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی ۔ اس نصب العین کو تدریسی مواد میں سمونے کے لیے مثالی دارالعلوم میں نصاب کی درجہ بندی کچھ اس طرح ہوگی :

(۱) قرآن ، حدیث ، فقہ ، تفسیر ، کلام وغیرہ کی تعلیم کو اس میں اوّلیت حاصل ہوگی ۔ یہ علوم کائنات کی روحانی احساس کو اُجاگر کرکے ذہن کو لاہوتی ساز و سامان سے لیس کریں گے ، پختہ سیرت کی تعمیر اور اعلیٰ کردار کی تشکیل کریں گے اور وہ مطمحِ نظر مہیا کریں گے جس کی بالا دستی میں بعد میں عمرانی اور طبیعی علوم کا مطالعہ کیا جائے گا ۔

۳۳۔ سید نذیر نیازی ، مترجم ، کتاب مذکور ، ص ۲۵۵ ۔

(۲) دوسرے درجے پر تاریخ ، اقتصادیات اور عمرانیات کے علوم آئیں گے جن کا ہماری انفرادی اور قومی زندگی کا رنگ اور رخ متعین کرنے میں کافی دخل ہوتا ہے ۔ تاریخی ، معاشی اور معاشرتی حالات کے مطابق روحانی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے ہمیں ''فکرِ دینی کو از سرِ نو تعمیر'' کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ قومی فکر اور تخیل پر دسترس حاصل کرنے کے لیے اقبال نے اس ضمن میں ''قومی لٹریچر'' کے مطالعے کو بھی ضروری قرار دیا ہے ۔

(۳) عمرانی علوم کے بعد یا ان کے ساتھ ساتھ استقرائی مشاہدے پر مبنی طبیعی علوم پڑھائے جائیں گے ۔ سائنس کی تحقیق اور ایجادات سے ہماری معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے ، سوچنے کے انداز بدلتے ہیں ، روحانی ضرورتوں میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور تسکینِ قلب کے لیے ہمیں ایک نئی دینیات اور علمِ کلام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔

علمِ حق کا سرچشمہ قرآن ہے ۔ حواس سے بھی ہمیں علمِ حق حاصل ہوتا ہے ، لیکن یہ علم کی ابتدا ہے ، انتہا نہیں ۔ اس کی آخری منزل وہ علم ہے جو شعور میں نہیں سماتا اور جس کا سرچشمہ وحی اور وجدان ہے ۔ حواس اور عقل سے حاصل ہونے والا علم بھی اسی منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن نے قدرت کا مشاہدہ کرنے کی بار بار تاکید کی ہے ۔ قدرت سے اس کی مراد ''انفس'' (نفسِ انسانی) اور ''آفاق'' (دنیا) ہیں ۔ ان دونوں میں اس نے خدا کی نشانیاں دکھانے کا وعدہ کیا ہے ۔ اس لیے اقبال نے ''انفس'' اور ''آفاق'' دونوں کے مشاہدے کو اپنے مثالی دارالعلوم کی نصابی سرگرمیوں میں شامل کیا ہے : ''قرآن مجید نے آفاق اور انفس دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور محسوسات اور مدرکات میں ، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی ، ہر کہیں ہو رہا ہے ۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے ۔''[۳۴]

۳۴- ایضاً ، ص ۱۹۴ ۔

سیرت کی تعمیر ، کردار کی تشکیل اور نفس کی تہذیب دینی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ۔ اس لیے اقبال نے دینی علوم کو اپنے نصب العین نواز نصاب میں پہلے درجے پر رکھا ہے ۔ اسی مناسبت سے پہلے ہم ''انفس'' اور پھر ''آفاق'' کے علم کی طرف رجوع کریں گے ۔ رسولِ اکرم ؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا ۔ اقبال کے الفاظ میں ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی'' ۔ ''اپنے من میں ڈوب کر'' ہی اسے پتا چلتا ہے کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے اسے تین مراحل سے ہو کر گزرنا ہے ۔ پہلے مرحلے میں نفس اپنے آپ کو محض ایک جسم سمجھتا ہے : ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے'' ۔ اس کا رجحان برائی کی طرف ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے وہ بالکل غافل ہوتا ہے ۔ نفس کی اس حالت کو قرآن نے نفسِ امارہ[35] کہا ہے ۔ دوسرے مرحلے میں روح بیدار ہوتی ہے ، غفلت کے پردے چھٹتے ہیں اور نفس اپنے آپ کو برائی میں ملوث ہونے پر لعن طعن کرتا ہے ، نیکی کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور برائی سے اپنا دامن بچاتا ہے ۔ نیکی کی طرف بڑھنے اور برائی سے بچنے کے عزم سے خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کے عمل کا آغاز ہوتا ہے ۔ نفس کی اس حالت کو قرآن نے نفسِ لوامہ[36] کہا ہے ۔ تیسرے اور آخری مرحلے میں جسمانی خواہشات اور روحانی تقاضوں میں کشمکش اور تصادم کی صورت ختم ہو جاتی ہے ۔ جسم روح کی اطاعت قبول کر لیتا ہے ۔ عقل فطرت کو مسخر کر لیتی ہے اور نفس کی بالا دستی قائم ہو جاتی ہے ۔ بندہ خدا سے راضی ہو جاتا ہے اور خدا بندے سے ۔ یہ ہے خدا کو اپنے اندر جذب کرنے کی معراج اور علم النفس کی آخری منزل ۔ قرآن نے نفس کی اس حالت کو نفسِ مطمئنہ[37] کہا ہے ۔

انفس ''عالمِ صغیر'' ہے تو آفاق ''عالمِ کبیر'' ۔ طبیعیات ، حیاتیات ، کیمیا ، ارضیات ، فلکیات وغیرہ کا تعلق علمِ آفاق سے ہے ۔ جس طرح انفس کا علم کتاب سے زیادہ خود اپنے من میں ڈوبنے سے حاصل ہوتا ہے ، اسی

۳۵- قرآن : ۱۲ : ۵۳ ۔
۳۶- قرآن : ۷۵ : ۲ ۔
۳۷- قرآن : ۹۰ : ۲۷ ۔

طرح آفاق کا صحیح علم کتب بینی سے زیادہ قدرتی مظاہر کے ذاتی مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے جو قوانینِ قدرت سے پرے صانعِ قدرت تک ہماری رہنمائی کرتا ہے ۔ خارجی مشاہدے کو اگر اندرونی بصیرت سے مربوط نہ کیا جائے تو علم ناقص ، ادھورا اور نامکمل رہتا ہے ۔ مروجہ نظامِ تعلیم میں مشاہدے کو بصیرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ تجربے اور مشاہدے سے زیادہ بے جان کتاب کو علم کا سرچشمہ سمجھتا ہے ۔ اس لیے اقبال اسے ملت کی روحانی ضرورتوں کے منافی سمجھتے ہیں :

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں !

* * *

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں ![۳۸]
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش ![۳۹]
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات ![۴۰]
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ ![۴۱]

قدرت خدا کا آرٹ ہے ۔ اس کا نظام جن اصولوں پر چل رہا ہے سائنس دان انھیں طبیعی قوانین کہتے ہیں ۔ ان قوانین کے پیچھے انھیں کوئی ابدی ہاتھ کارفرما نظر نہیں آتا ۔ قرآن انھیں میکانکی قوانین کے بجائے آیاتِ الٰہیہ کہتا ہے جن کا ظہور آفاق میں ہر جگہ اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح انفس میں ۔ سائنس ہر چند انھیں میکانکی قوانین کہے لیکن ''مشاہداتِ حکیم''

۳۸- ''ضربِ کلیم'' (کلیات) ، ص ۵۴۴ -
۳۹- ایضاً ، ص ۵۴۵ -
۴۰- ''بالِ جبریل'' (کلیات) ، ص ۳۹۸ -
۴۱- ''ضربِ کلیم'' (کلیات) ، ص ۵۴۷ -

کو ''تجلیاتِ کلیم'' سے ہمکنار کر لینے والے ''بینائے کواکب'' اور ''دانائے نباتات'' کو ان میں ''فطرت کا سرودِ ازلی'' بھی سنائی دے گا اور ''بوئے گل'' کا سراغ بھی ان سے ملے گا۔

اب ہم مثالی دارالعلوم کے نصب العین نواز نصاب میں عمرانی علوم کی اہمیت کی طرف رجوع کریں گے۔ اپنے خطبۂ علی گڑھ میں اقبال نے، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، تاریخ، معاشیات اور عمرانیات کے علاوہ قومی لٹریچر کے مطالعے کو اخلاق و دین کی تلقین کرنے والوں کے لیے ضروری قرار دیا تاکہ ان کے دین سے متعلق علم میں جامعیت اور ان کے نقطۂ نظر میں وسعت پیدا ہوا۔ وجدان سے حاصل ہونے والے علم کو تجربے سے حاصل ہونے والے علم سے مربوط کرکے ہی ''فکرِ دینی کی از سرِ نو تعمیر'' ہو سکتی ہے۔ عملی زندگی میں معاشیات کی اہمیت کے مدِنظر اُنھوں نے خود بھی ''علم الاقتصاد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۰۳ میں شائع ہوئی۔ ''رموزِ بےخودی'' کے دیباچے میں اُنھوں نے قومی تاریخ کی حفاظت پر ان الفاظ میں زور دیا:

''افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل اور استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلۂ قوتِ حافظہ ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات اور اعمال کو مربوط کرکے قومی انا کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔''[۳۲]

''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں آنھوں نے قرآنی تعلیمات کے مطابق ''انفس'' اور ''آفاق'' کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی علم کا ذریعہ قرار دیا۔ قرآن نے تاریخ کے لیے ''ایام اللہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ تاریخ ''اللہ کے دن'' یا کام ہے اور اس میں صبر اور شکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔[۳۳] وہ مقاصدِ الٰہی کی حامل ہے۔ جس طرح دن اور

۳۲۔ سید عبدالواحد معینی، مولف، کتاب مذکور، ص ۱۹۱ - ۱۹۲۔
۳۳۔ قرآن: ۱۴: ۵۔

رات کے آنے جانے ، دریاؤں میں کشتی چلنے ، بادلوں سے پانی برسنے اور زمین سے اناج اُگنے میں ہوش مندوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں ، اسی طرح قوموں کے عروج و زوال میں اربابِ دانش کے لیے اخلاق سبق ہے کہ قوموں کے کردار پر ہمیشہ اجتماعی حیثیت سے حکم لگایا جاتا ہے اور یہ کہ ان کی بد اعمالیوں کی سزا انہیں اس دنیا ہی میں ملتی ہے ۔ اہلِ بصیرت اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں ۔ اللہ کا قانون کبھی بدلتا نہیں خواہ اس کا تعلق طبیعیات سے ہو یا تاریخ سے ، قدرتی مظاہر سے ہو یا اقوام کے کردار سے ۔

یہ ہے خدا کو اپنے اندر جذب کر لینے کے لیے اقبال کے مثالی دارالعلوم کے نصاب کا خاکہ ۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے علومِ اسلامیہ کے نصاب پر اقبال کا تبصرہ ۔

۱۹۲۵ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد نے علومِ اسلامیہ کا ایک نیا شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اس کے چار بنیادی مقاصد تھے :

(۱) بہتر اور مسلمہ جامعیت کے علما و فقہا پیدا کرنا ۔

(۲) ایسے عالم پیدا کرنا جو اسلامی افکار و ادبیات کے مختلف شعبوں میں اپنی تحقیقات سے اسلامی تمدن اور موجودہ علوم کے درمیان حیاتِ دماغی کا جو تسلسل پایا جاتا ہے ، اس کی از روئے نشو و نما جستجو کریں ۔

(۳) ایسے عالموں کو تیار کرنا جو اسلامی تاریخ ، آرٹ ، علمِ تہذیب و تمدن ، سائنس اور فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوں ۔

(۴) ایسے عالموں کا پیدا کرنا جو اسلام کے قانونی لٹریچر میں تحقیق و تدقیق کے لیے موزوں ہوں ۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے اقبال کے استاد سر طامس آرنلڈ نے مختلف امتحانات کے لیے مندرجہ ذیل نصاب تجویز کیا[۳۴] :

(الف) معمولی بی ۔ اے کی ڈگری کا نصاب :

(۱) فرقہ جاتِ اسلام

۳۴۔ محمد حسین خان زبیری ، مولف ، کتاب مذکور ، ص ۲۶۲ ۔

(۲) اسلام کا سیاسی نظریہ
(۳) اسلامی علم الانساب

(ب) بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری کا نصاب :
(۱) فرقہ جات اسلام
(۲) اسلام کا سیاسی نظریہ
(۳) اسلامی علم الانساب
(۴) اسلام کا دیگر مذاہب سے رشتہ یا سلوک ـــــ روا داری و عدم روا داری

(ج) ایم۔ اے کی ڈگری کا نصاب :
(۱) اسلامی اصول فقہ کی ابتدا اور ان کا ارتقا
(۲) مسلمانوں کا فلسفۂ اخلاق و مابعد الطبیعیات
(۳) عالم اسلام میں سائنس کا درجہ
(۴) ڈپلومیسی (حیل سازی) متعلق بر ممالک غیر اسلامی
(۵) عالم اسلام پر بیرونی اثرات

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے مشاہیر ملت کو علوم اسلامیہ کے شعبے کے متذکرہ بالا مقاصد اور مجوزہ نصاب پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ اقبال نے بھی ایک خط کے ذریعے انہیں اپنی رائے سے مطلع کیا۔ ۴ جون ۱۹۲۵ کا لکھا ہوا یہ خط انگریزی میں ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۲۶ کے ''سہیل'' میں شائع ہوا اور اس کے بعد ''اقبال ریویو'' بابت اکتوبر ۱۹۶۲ میں۔ شیخ عطاء اللہ کی تالیف ''اقبال نامہ''، حصہ دوم، میں یہ خط شامل ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب اقبال اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے انگریزی میں ایک مقالہ ''اجتہاد'' پر لکھا لیکن بعض امور میں مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اسے شائع نہیں کیا۔ بہرحال وہ بڑی سنجیدگی سے اس مسئلے کی تحقیق میں مصروف رہے۔ سید سلیمان ندوی کو ۷ اپریل ۱۹۲۶ کے خط میں وہ لکھتے ہیں :

''عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیش نظر نہیں ہے بلکہ میں نے اپنے مضمون میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے

کی کوشش کی ہے ۔ ہاں معاملات کے متعلق بعض سوالات دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں چونکہ شریعتِ احادیث (یعنی وہ احادیث جن کا تعلق معاملات سے ہے) کا مشکل سوال پیدا ہو جاتا ہے اور ابھی تک میرا دل اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں ہوا ، اس واسطے وہ مضمون شائع نہیں کیا گیا ۔ میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے ، مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں ۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے ۔''۳۵

دسمبر ۱۹۲۸ کے اواخر میں اقبال نے مدراس میں اسلام پر تین لیکچر دیے جو چار دیگر لیکچروں کے اضافے کے ساتھ ۱۹۳۰ میں ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ۔ اس کتاب کا چھٹا لیکچر ''اجتہاد فی الاسلام'' پر ہے ۔ یہ وہی لیکچر ہے جس کا ذکر اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام اپنے خط میں کیا ہے ۔

اقبال کے نزدیک دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا ہے ۔ اسی ضرورت کے مدِنظر انھوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو مذکورہ بالا خط میں لکھا :

''میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کر سکتا ۔ میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے ۔ ۔ ۔ ۔

''میں آپ کی اس تجویز سے پورے طور پر متفق ہوں کہ دیوبند اور لکھنو کے بہترین مواد کو برسرِکار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے ۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دینے کے بعد کیا کریں گے ؟ کیا آپ ان کو بی ۔ اے اور ایم ۔ اے بنائیں گے جیسا کہ سر ٹامس آرنلڈ کی تجویز ہے ؟ مجھے یقین ہے جہاں تک دینیاتی افکار دماغی کے مطالعہ یا ترقی کا تعلق ہے وہ آپ کے مقصد کو پورا نہیں کر سکیں گے ۔ دیوبند اور لکھنو کے وہ لوگ جو علمِ دینیات پر غور و فکر کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہوں ، ان کو میرے نزدیک قبل اس

۳۵۔ شیخ عطاء اللہ ، مولف ، کتاب مذکور ، ۱/۱۴۶ - ۱۴۷ ۔

کے کہ وہ آرنلڈ کے مجوزہ نصاب کو عبور کرنے دیے جائیں جس کو ان کی ضرورتوں کا خیال کرکے بہت مختصر کر دینا پڑے گا ، افکارِ جدیدہ اور سائنس سے آشنا کر دیا جائے ۔ جدید سائنس اور خیالات کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ان کو آرنلڈ کے مجوزہ نصاب کے ایسے مضامین پر لیکچر سننے کو کہا جا سکتا ہے جو ان کے خاص مضامین سے متعلق ہوں ۔ مثلاً اسلام کے فرقہ جات اور اسلامی اخلاق اور فلسفہ مابعد الطبیعیات ۔ اس تربیت کے بعد انھیں مسلم دینیات ، کلام اور تفسیر پر مجتہدانہ خطبہ دینے کے لیے یونیورسٹی فیلو بنایا جائے ۔ صرف یہ لوگ یونیورسٹی میں دینیات کا ایک نیا اسکول قائم کر سکیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ میری تجویز یہ ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کا قدامت پسند عنصر مطمئن ہو جائے تو آپ قدیم طرز کی دینیات کے اسکول سے ابتدا کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر آپ کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ آپ تدریجاً اس کے بجائے ان لوگوں کی جماعت کو کارفرما بنائیں جو میری تجویز کردہ اسکیم کے مطابق خود اجتہادِ فکر پر قادر ہوں گے ۔

"دیوبند اور لکھنو کے وہ لوگ جو خالص سائنٹیفک تحقیقات کا مخصوص ذوق رکھتے ہوں ، ان کے میلاناتِ طبعی کے مطابق جدید ریاضیات ، سائنس اور فلسفہ کی مکمل تعلیم دینی چاہیے ۔ جدید سائنس اور حکمت کی تعلیم کو پورا کرنے کے بعد اُن کو اجازت دی جانے کہ وہ آرنلڈ کا کورس پورا کریں جس کو ان کی ضرورتوں کا لحاظ کرکے مختصر کر دیا جانے گا ۔ مثلاً صرف اس شخص کو آرنلڈ کورس کا نمبر ۳ 'دنیائے اسلام اور سائنس' پر لیکچر سننے کی اجازت دی جائے جو صرف طبعی سائنس پڑھ چکا ہے ۔ اس کے بعد اسے آپ یونیورسٹی فیلو بنا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنا پورا وقت خاص سائنس میں ریسرچ پر صرف کرے جس کا اس نے مطالعہ کیا ہے ۔

''آرنلڈ کا کورس ان لوگوں کو لینے کی اجازت ہونی چاہیے جو سائنس اور فلسفہ میں خاص دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ مسلم تمدن اور تہذیب کے اصولوں کی عام تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اسے صرف لکھنو اور دیوبند کے لوگوں تک محدود نہیں کرنا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کورس میں مسلم آرٹ اور فنِ تعمیر بھی شامل کرنا چاہتا ہوں ۔

''ہمیں دیوبند اور لکھنو سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہییں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں ، چونکہ قانونِ محمدی سر تا سر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے ۔ ہم کو چاہیے کہ انھیں اصولِ فقہ اور قانون سازی کے اصولوں کی تعلیم دیں اور شاید جدید اقتصادیات اور اجتماعیات [عمرانیات] کی جامع تعلیم دینے کی بھی ضرورت پیش آئے ۔ اگر

آپ چاہیں تو ان کو ایل ۔ ایل ۔ بی بنائیں اور پھر آرنلڈ کا کورس پڑھنے کی اجازت دیں مگر ان کے لیے بھی کورس میں تخفیف کرنا پڑے گی ، مثلاً ان سے کہا جائے گا کہ 'سیاسی نظریہ' اسلامیہ' اور 'اسلامی اصولِ فقہ' کا ارتقا وغیرہ کے مضامین کے لیکچروں میں شریک ہوں ۔ بعضوں کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے دیا جائے ۔ دوسروں کو یونیورسٹی کی فیلو شپ اختیار کرنے کی اجازت دی جائے ۔ کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لیے وقف کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمان قانون دان جن کا پیشہ وکالت ہو اور جو قانونِ محمدی کے اصولوں پر پوری طرح حاوی ہوں ، وہ عدالت اور کونسل دونوں میں بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں ۔

"مختصراً میری تجاویز حسب ذیل ہیں : جو نصاب سر ٹامس آرنلڈ نے تجویز کیا ہے میں اس کو قبول کرتا ہوں ، مگر پورا کورس صرف ان طالب علموں کو لینے کی اجازت ہونی چاہیے جو قانونی دینیات اور سائنس کے لیے کوئی خاص ذوق نہ رکھتے ہوں ۔ جہاں تک دینیات کی تعلیم کا تعلق ہے میں آپ کی تجویز ۔ ۔ ۔ کو تسلیم کرتا ہوں مگر اسے صرف عارضی اور امتحانی حیثیت دینا چاہتا ہوں ۔ اس کی جگہ رفتہ رفتہ ان لوگوں کے لیے اور ان کے لیے جو قانون اور خاص علوم کا مطالعہ کریں گے آرنلڈ کا کورس ان کی ضروریات کے لحاظ سے مختصر کرنا پڑے گا ۔ یہ جتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو اسلامی حکمت ، ادبیات ، آرٹ ، تاریخ نیز دینیات کا نصاب اختیار کریں گے ، جرمن اور فرنچ زبانوں کا حسب ضرورت جاننا از بس ضروری ہے ۔

"۔ ۔ ۔ آپ ندوہ اور دیوبند کے لوگوں کو انٹرمیڈیٹ کے معیار تک پہنچانا چاہتے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے پر مجبور کیے جائیں ۔ یہاں وہ سوائے انگریزی کے کوئی دوسری زبان اختیار نہ کر سکیں گے ۔ دوسرے مضامین میں وہ حسب ذیل مضامین اختیار کر سکیں گے : (الف) علومِ طبعی ، (ب) ریاضیات ، (ج) فلسفہ ، (د) اقتصادیات ۔

"چونکہ ان کو انگریزی کی تعلیم محض کام چلانے کے مطابق حاصل کرنی ہوگی ، میں یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانات ایم ۔ اے اور بی ۔ اے سے انگریزی کو بالکل حذف کر دینا چاہتا ہوں ۔ ان امتحانوں میں ان کو صرف سائنس اور فلسفہ کے مضامین لینے کی ضرورت ہوگی ۔"[۳۶]

۳۶- ایضاً ، ۲/۲۱۶-۲۲۵ ۔

"اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل" کرکے "فکرِ دینی کی از سرِ نو تعمیر کرنا" وہ بنیادی مقصد ہے جس کے حصول کے لیے اقبال نے ۱۹۱۰ میں ایک "مثالی دارالعلوم" کے قیام کی تجویز پیش کی تھی ۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر انھوں نے ۱۹۲۵ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے علومِ اسلامیہ کے مجوزہ نصاب پر اپنی رائے کا اظہار کیا ۔ آرنلڈ کا مجوزہ نصاب ان کے نزدیک قوم کی بدلی ہوئی روحانی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا تھا ۔ اس لیے انھوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو صاف لکھ دیا کہ وہ مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے بالکل اتفاق نہیں کرتے اور یہ کہ ان کے خیال میں قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ کھولنا قطعی بے سود ہے ۔ لیکن خط کے آخر میں ان کے لہجے کی تیزی و تندی نرمی میں بدل جاتی ہے اور وہ اس بات پر مفاہمت کر لیتے ہیں کہ معاشرے کے قدامت پرست طبقے کی تالیفِ قلب کے لیے "قدیم طرز کے دینیات کے اسکول" سے ابتدا کی جائے اور رفتہ رفتہ اس کی ہیئت اس طرح بدلی جائے کہ یہاں سے جو لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلیں وہ "خود اجتہادی فکر پر قادر ہوں" ۔

موثر تعلیم کا انحصار طلبا کی اپنی دلچسپیوں اور صلاحیتوں پر ہے ۔ اس اعتبار سے ندوہ اور دیوبند کے طلبا کو اقبال نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے چار انواع میں تقسیم کیا : دینیاتی امور میں بصیرت، اور غور و خوض کرنے کی صلاحیت رکھنے والے طلبا ، سائنسی تحقیق و تدقیق کا ذوق رکھنے والے طلبا ، فقہ اور قانون میں دلچسپی رکھنے والے طلبا اور اسلامی تہذیب و تمدن سے شغف رکھنے والے طلبا ۔ اس تقسیم کو ملحوظ رکھ کر پھر انھوں نے ہر طالب علم کی ضروریات کے مطابق آرنلڈ کورس میں تخفیف اور اضافے کی حسبِ ذیل تجاویز پیش کیں :

(۱) جو طلبا دینیات یا الٰہیاتِ اسلامیہ سے شغف رکھتے ہوں ان کو چاہیے کہ قرآن کی استقرائی روح کے مطابق پہلے وہ جدید سائنس اور عمرانیات کا مطالعہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ جدید فلسفہ پڑھیں تا کہ روحانی ضرورتوں سے متعلقہ فکری اور معاشرتی عوامل کا انھیں پورا پورا شعور حاصل ہو ۔ اس کے بعد وہ آرنلڈ کے علومِ اسلامیہ کے ایم ۔ اے کے مجوزہ نصاب میں سے صرف وہ مضامین پڑھیں جن کا دینیات سے براہِ راست

تعلق ہو ، مثلاً اسلام کے فرقہ جات ، اسلام کا فلسفہ اخلاق اور مابعد الطبیعیات وغیرہ ۔ فقہ ، ڈپلومیسی ، عالم اسلام میں سائنس وغیرہ کے مضامین ان کے نصاب سے خارج ہوں گے ۔ اس کورس کو مکمل کرنے کے بعد انھیں دینیات ، کلام اور تفسیر پر ''مجتہدانہ'' لیکچر دینے کے لیے یونیورسٹی فیلو بنایا جائے ۔ ''صرف یہ لوگ ہی یونیورسٹی میں دینیات کا ایک نیا اسکول قائم کر سکیں گے ۔''

(۲) اسی طرح وہ طلبا جو سائنس یعنی طبیعیات ، کیمیا ، حیاتیات وغیرہ میں تحقیق و تدقیق کا شوق اور صلاحیت رکھتے ہوں انھیں پہلے جدید سائنس ، فلسفہ اور ریاضی کی مکمل تعلیم دی جائے اور پھر وہ حسب ضرورت آرنلڈ کورس پڑھیں ۔ وہ صرف عالم اسلام میں سائنس کا مضمون پڑھیں گے ۔ باقی مضامین ان کے کورس سے خارج ہوں گے ۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھیں یونیورسٹی فیلو بنایا جائے تاکہ وہ سائنس میں تحقیقی کام کریں ۔ اس کی ترقی میں مسلمانوں نے جو کردار ادا کیا ہے اسے منظر عام پر لائیں ۔ ان کے استقرائی طریق تحقیق اور اس کے ثمرات کا مغربی اقوام پر جو اثر پڑا اس کی نشان دہی کریں اور ازمنہ وسطیٰ اور دور جدید کی سائنس میں فکری تسلسل کی مبسوط تاریخ مرتب کریں ۔

(۳) جن طلبا کی دلچسپی فقہ اور قانون میں ہو انھیں قانون ملی کی تشکیل نو کا اہم فرض ادا کرنے کے لیے تیار کیا جائے ۔ تاریخی اور معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ روحانی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں ۔ اس لیے یہ لوگ پہلے تاریخ ، اقتصادیات اور عمرانیات کا مطالعہ کریں گے ۔ بہتر یہ ہے کہ وہ ایل ۔ ایل ۔ بی بھی کریں ۔ اس کے بعد حسب ضرورت آرنلڈ کورس پڑھیں ۔ وہ صرف اسلامی اصول فقہ اور قانون سازی اور اسلام کے سیاسی نظریے کے مضامین پڑھیں گے ۔ باقی مضامین ان کے کورس سے خارج ہوں گے ۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان میں سے بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے دیا جائے ۔ یہ لوگ عدالتوں اور اسمبلیوں میں بہت مفید ثابت ہوں گے ۔ بعض کو فقہ اور قانون سازی پر تحقیقی کام کرنے اور لیکچر دینے کے لیے یونیورسٹی فیلو بنایا جائے ۔

(۴) آرنلڈ کا پورا کورس ، جو پانچ مضامین پر مشتمل ہے ، صرف

ان لوگوں کو لینے کی اجازت دی جائے جو دینیات ، سائنس یا قانون سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے ہوں بلکہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں ۔ اس کورس میں اقبال مسلم آرٹ اور فن تعمیر کا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں ۔ جو لوگ اسلامی فلسفہ ، ادبیات ، آرٹ ، تاریخ یا دینیات کا کورس لیں گے ، ان کے لیے جرمن اور فرانسیسی زبانوں کا جاننا ضروری ہوگا ۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ جب جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غرق تھا تو اسلامی سائنس ، فلسفہ ، آرٹ ، ادبیات اور دینیات نے ہی اسے روشنی کی کرن دکھائی ۔ اسلامی علوم و فنون پر جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں کتابیں لکھی گئیں ، عربی کتابوں کے ترجمے کیے گئے جو یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیے گئے ۔ یہ ترجمے تاحال یورپ کی لائبریریوں میں موجود ہیں لیکن اصل عربی کتب اکثر و بیشتر نایاب ہیں ۔ اس ثقافتی سرمائے تک ہماری رسائی جرمن اور فرانسیسی زبانوں ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے ۔

دینیات ، سائنس اور قانون کی تعلیم سے متعلق پہلے تین کورسز کو بے شک دیوبند اور ندوہ کے فارغ التحصیل ذہین اور طباع لوگوں تک محدود رکھا جائے لیکن اسلامی تہذیب و تمدن کے کورس پر یہ پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے تاکہ دوسرے اداروں کے لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں ۔ ندوہ اور دیوبند کے لوگوں کو انٹرمیجیٹ کے معیار تک پہنچانا کافی نہیں ۔ ان کے لیے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ انٹرمیجیٹ کا امتحان پاس کریں ۔ یہاں وہ انگریزی کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں پڑھیں گے ۔ باقی مضامین طبیعی علوم ، ریاضی ، فلسفہ اور اقتصادیات میں سے اختیار کریں گے ۔ انگریزی کی صرف کام چلانے کی حد تک ضرورت ہے ، اس لیے بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کے نصاب سے اسے خارج کر دینا چاہیے ۔ ان امتحانات میں سائنس اور فلسفے کے مضامین پڑھنے کی زیادہ ضرورت ہے ۔

اس تبصرے سے دو باتیں واضح ہوکر سامنے آتی ہیں : ایک یہ کہ موثر تعلیم کے لیے طلبا کی اپنی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ دوسری یہ کہ تعلیم کا مقصد ثقافتی سرمائے کو نئی نسل میں صرف منتقل کرنا ہی نہیں بلکہ بدلی ہوئی روحانی ضروریات کے مطابق

اس کی تجدید اور تعمیرِ نو بھی کرنا ہے۔ ''جس قسم کا علمِ کلام اور علمِ دین ازمنہ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکینِ قلب کے لیے کافی ہوتا تھا، وہ آج تسکین بخش نہیں ہے'' ۔ اس سے اقبال کا مقصود ''مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا'' نہیں بلکہ فقہائے متقدمین کی طرح ''اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا'' اور ''فکرِ دینی کی از سرِ نو تعمیر کرنا ہے'' ۔ نئی دینیات اور نیا علمِ کلام ہی موجودہ دور کے مسلمانوں کی روحانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لیے اجتہاد وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن فقیہہ بے توفیق کو اقبال یہ حق نہیں دینا چاہتے :

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر　　اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

ایک التماس

مضمون نگار حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنے مضامین کے پہلے اور آخری صفحات پر اپنا نام ، عہدہ/پیشہ ، مکمل پتا لازماً تحریر کریں ۔ اگر آپ کو اپنے مضمون کے پانچ سے زیادہ آف پرنٹ درکار ہیں تو یہ بھی پہلے صفحہ پر نمایاں طور پر لکھ دیں ۔ صرف کاغذ کی قیمت آپ کے معاوضے میں سے وضع کی جائے گی ۔

مضمون کاغذ کی صرف ایک طرف مناسب حاشیہ چھوڑ کر لکھیں ۔ حواشی کو مسلسل نمبر دیں اور مناسب ہوگا کہ آپ حواشی مضمون کے آخر میں ایک ہی جگہ تحریر کریں ۔

—— مدیر ''اقبال ریویو''